سلمیٰ زمن

ابّا جان

مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور ہمارے آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ ابّا جان ایک نیچی بید کی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور میری بڑی بہن اور میں ابّا جان کے اِدھر اُدھر کرسی کے دونوں ہتھوں پر بیٹھے تھے۔ ابّا جان ہم لوگوں کو ترنم کے ساتھ صفی لکھنوی کی نظم "زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے" یاد کرا رہے تھے۔ اس شام گھر بھر کے سارے بچوں نے بانس پر دوپٹہ باندھ کر ایک جھنڈا بنایا اور باہر کے میدان میں زور زور سے یہ نظم گاتے ہوئے گھر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک چھوٹے سے گروپ کی شکل میں مارچ کرتے رہے۔ اس دن کے بعد سے کئی ہفتوں تک ہم بچّوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہم اِس نظم کے ایک ایک شعر کو بڑے جوش و خروش سے گاتے ہوئے روزانہ شام کو جلوس نکالا کرتے۔ ہمیں یہ نظم اچھی طرح یاد ہو گئی تھی اور یہ شعر خاص طور پر ہمیں بہت پسند تھا:

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں، ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے

شاید اِس لیے کہ یہ آسان زبان میں تھا اور ہماری سمجھ میں آتا تھا۔

مجھے اپنے ابا جان بہت اچھے لگتے تھے۔ سب سے زیادہ۔ اپنی والدہ جنھیں میں "آپا" کہتی تھی اور دادا میاں سے بھی زیادہ جنھیں میں بہت چاہتی تھی۔ ابا جان نے کبھی ہمیں ڈانٹا نہیں۔ وہ بہت مصروف آدمی تھے۔ ہر وقت اُن کے پاس دیوان خانے میں لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ کچھ تو کام کے سلسلے میں آتے تھے اور کچھ اُن کے دوست ہوا کرتے۔ ابا جان جب اندر آتے تو سب سے پہلے ہمیں (سب بچّوں کو) پیار ضرور کرتے۔ کبھی گالوں پر کبھی دونوں کانوں پر باری باری جس سے ہمیں گدگدی لگتی لیکن مزا بہت

ؔ فیاض علی مرحوم، سابق اٹارنی جنرل پاکستان، مصنف "شمیم" و "انور"

آتا تھا۔ وہ کتنے ہی معروف کیوں نہ ہوں پیار کرنا کبھی نہ بھولتے۔ اُن کی یہ عادت ہمیشہ قائم رہی یہاں تک کہ ہم خود بچّوں والے ہو گئے۔

انتہائی مصروفیت کے باوجود کیوں کہ وہ شہر فیض آباد کے کامیاب ایڈووکیٹ تھے، جب بھی انھیں وقت ملتا وہ ہم ساتوں بہن بھائیوں کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتے۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں وہ کوٹھے کے صحن میں سوتے تھے اور سونے سے پہلے کبھی کبھی وہ لیٹ کر ہمیں کہانیاں سناتے تھے۔ بڑے بچّوں کو اپنی دونوں بانہوں پر اِدھر اُدھر لٹا کر اور چھوٹوں کو اپنے اوپر بٹھا کر۔ شیکسپیر کے "جولیس سیزر" اور "مرچنٹ آف وینس" کی کہانیاں انھوں نے اِسی طرح ہمیں سنائی تھیں۔ کولمبس اور مارکو پولو کی کہانی بھی انھوں نے ہمیں سنائی تھی۔

مجھے گرمیوں کی وہ دوپہریں بھی یاد ہیں جب آپا برآمدے میں مشین پر ہمارے کپڑے سیا کرتیں اور اباجان برابر والے کمرے میں ہمیں نظمیں اور اشعار یاد کراتے تھے۔ اُس وقت ہمارا نام اسکول میں نہیں لکھوایا گیا تھا۔ میرؔ کا یہ شعر اُسی زمانے میں اباجان نے مجھے یاد کرایا تھا:

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہوِ وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

اس وقت میری عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی اور مجھے میرؔ کے اِس شعر کے معنی بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن شاید اس شعر کی موسیقیت نے اس وقت بھی میرے دل پر اثر کیا تھا اور یہ شعر مجھے بہت جلد یاد ہو گیا تھا۔

اباجان کا رنگ سانولا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت۔ جڑی ہوئی گھنی بھنویں۔ ٹھوڑی پر گڑھا۔ کھڑی ہوئی ناک۔ پتلے مسکراتے ہونٹ۔ میں سوچا کرتی کہ میرے اباجان سے اچھا دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا جب آپا کی خالہ زاد، چچا زاد بہنیں اباجان کے سانولے رنگ کا مذاق اڑاتیں۔ اور مجھے یاد ہے کہ میں بہت خوش ہوتی جب اباجان اُن سے کہتے کہ رام چندر جی اور کرشن چندر جی کا رنگ بھی تو سانولا تھا —— وہ اتنے اچھے تھے کہ لوگ ان سے بہت محبت کرتے اور انھیں اپنی آنکھوں

کی پتلیوں میں جگہ دیتے۔ پتلیاں چونکہ کالی ہوتی ہیں اس لیے اُن میں رہتے رہتے اُن کا رنگ بھی سانولا ہو گیا تھا۔

ابا جان کو ہمیشہ میں نے مصروف ہی دیکھا۔ کام کرتے یا لکھتے پڑھتے ہوئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اُن کا ناول "شمیم" میری پیدائش سے پہلے شائع ہو چکا تھا اور جب میں چھٹے ساتویں درجے میں پڑھتی تھی تو وہ اپنا دوسرا ناول "انور" لکھ رہے تھے۔ اس کا مسودہ اکثر اُن کے کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ مجھے اُردو کی کہانیاں اور ناول پڑھنے کا اُس زمانے میں شوق پیدا ہو گیا تھا، اور ہمارے گھر میں کئی رسالے "عصمت" "جوہر نسواں" "رومان" "ساقی" "نگار" "ہمایوں" وغیرہ آیا کرتے۔ جو میں اور میری بہن حسن آپا بہت جلدی جلدی پڑھ کر ختم کر لیتے۔ جیسے ہی کوئی رسالہ آتا حسن آپا اور میں اُس کو لے لیتے اور دونوں ہی پڑھنا چاہتے۔ تو فیصلہ اس طرح ہوتا کہ ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھیں اور جو پہلے پڑھ لے وہ دوسرے کے ورق الٹنے کا انتظار کرے۔ ہم صرف کہانیاں ہی پڑھتے۔ شعر و شاعری سے اُس وقت ہمیں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ شاعری ہماری سمجھ میں آتی تھی۔

لیکن اباجان کے ناول ہمیں پڑھنے کو نہیں دیے گئے۔ اور مسوّدوں کو تو چھونے کی بھی اجازت نہیں تھی، لیکن جب ابا جان کورٹ چلے جاتے تو میں اُن کے کمرے میں مسہری پر اوندھی لیٹ کر اور "انور" ناول کا مسودہ زمین پر رکھ کر پڑھا کرتی تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں اُس وقت ساتویں درجے میں پڑھتی تھی، لیکن ہمیں بزرگوں سے یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ خود ابا جان کی تحریر کو ہمیں پڑھنے کی اجازت کیوں نہیں۔ ظاہر ہے کہ منع کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوا کیونکہ چھپنے سے پہلے میں پورے ناول کا مسودہ پڑھ چکی تھی۔

ابا جان شہر کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے تھے اور کئی سال تک وہ میونسپلٹی کے ممبر بھی منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں میں نے چھٹے درجے کا امتحان دیا تھا۔ اس سال عید الضحیٰ کے موقع پر فیض آباد کے ہندو اور مسلمانوں میں گائے کے ذبح کرنے کے سلسلے میں سخت کھچاؤ پیدا

ہوگیا تھا۔ شہر کا کلکٹر ہندو تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہندوؤں کی طرفداری کر رہا ہے۔ ہندوؤں کا مقدس شہر اجودھیا فیض آباد سے چند میل کے فاصلے پر ہے (آج بھی یہ شہر بابری مسجد کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعہ کا مرکز بنا ہوا ہے)۔ عید الضحیٰ کے زمانے میں اجودھیا میں ہندوؤں کا کوئی بہت بڑا میلہ ہونے والا تھا جس میں ملک کے دوسرے حصّوں سے لوگ شامل ہونے والے تھے۔ اُنھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عید الضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ انھیں قربانی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ وہ اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ اور ہندوؤں کے منع کرنے سے اُن کی "آن" کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ فیض آباد سے اجودھیا تک ہندو مسلمانوں میں ٹھن گئی۔ مسلمانوں نے اپنا سربراہ اباجان کو بنا لیا۔ کیونکہ میونسپلٹی میں وہ اُن کے منتخب نمائندے تھے۔ یہ واقعہ ١٩١٩ء کی تحریک ترک موالات سے بہت بعد کا ہے، جب ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ یکجہتی کے جوش میں خود ہی کئی سال تک گاؤکشی بند کر دی تھی لیکن انھیں اپنی اِس مروت کا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوا تھا کیونکہ اِس کے باوجود ہندو مسلمانوں میں سیاسی یا سماجی موافقت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ دونوں فرقوں میں پھر کشاکش پیدا ہو گئی۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر میں ہر وقت ایک مجمع لگا رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ جمع رہتے تھے اور اُن کے لیے چائے اور کھانے کا انتظام رہتا تھا۔ اباجان زیادہ تر باہر ہی رہتے اور ہم بچوں سے نہیں مل سکتے تھے۔ ایک دن میں نے آپا سے پوچھا کہ اباجان کہاں ہیں تو انھوں نے بڑی حسرت سے کہا "کیا بتائیں کہاں ہیں وہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں۔" چنانچہ ہوا یہ کہ عید الضحیٰ کے دن اپنے چند مسلمان ساتھیوں کو لے کر وہ اجودھیا گئے۔ ہندوؤں کے ایک بہت بڑے مجمع نے اُنھیں گھیرے میں لے لیا لیکن انھوں نے گائے کی قربانی کی۔ کسی نے اُن پر پتھر پھینکے لیکن وہ انھیں لگ نہیں سکے بلکہ ان کے ایک نوجوان ساتھی کو لگے جس کی پیشانی پر چوٹ آئی لیکن قربانی کرنے کے بعد اسی مجمع کے درمیان سے گزرتے ہوئے اباجان اور

اُن کے ساتھی واپس آ گئے۔ ابا جان کہتے تھے کہ کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اُن کا راستہ روکتا۔

ہمارا فیض آباد کا گھر دو حصّوں میں تھا، ایک حصّہ تو خواتین کے لیے تھا اور اس کے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دوسرا حصّہ "دیوان خانہ" مردوں کے لیے تھا۔ ابا جان کا دفتر نیچے کے حصّہ میں تھا۔ اُس کے اوپر پردادامیاں کا کوٹھا تھا جس کے چاروں طرف نیچے کے چو طرفہ برآمدوں کی چھت تھی۔ اس چھت کے گرد تقریباً تین فٹ اونچی کنگورے دار منڈیریں تھیں جو اندر کے حصّے سے صاف نظر آتی تھیں۔ ہم لوگ جب اپنے کوٹھے پر جاتے تو وہاں سے اس چھت پر ابا جان، چچا میاں اور پھوپھا میاں بندوقیں ہاتھ میں لیے ہوئے ٹہلتے نظر آتے تھے۔ ہم لوگوں کو اُس وقت باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ انھیں دنوں ہندو مسلم فساد کی خبریں سن کر کچھ سرحدی پٹھان بھی وہاں آ گئے تھے۔ ایک دن یہ لوگ "پیاز علی" (ابا جان کا بگڑا ہوا نام) کو پوچھتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور کہنے لگے کہ "سنا ہے کہ یہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے ہم سرحد سے تمھاری مدد کرنے آئے ہیں۔ مجال نہیں کہ کوئی تمھیں نقصان پہنچائے۔ ہم تمھارے گھر کی حفاظت کریں گے۔" چنانچہ وہ ہمارے گھر مقیم ہو گئے مجھے یاد نہیں کہ کب تک رہے، لیکن جب تک فساد کا خطرہ رہا یہ لوگ ہمارے گھر رہے تھے۔ اِسی دوران ایک رات ایسا لگا جیسے ہمارے گھر کے باہر کسی نے آگ لگا دی ہو۔ اور آگ کے شعلوں کا عکس ہمارے آنگن سے ہمیں بیل کے اونچے سے درخت پر نظر آ رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِس درخت میں آگ لگی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت ہم سب کے پلنگ آنگن میں بچھے ہوئے تھے اور اُن پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ پھوپھی جان نے گھبرا کر کہا جلدی باہر نکلو کسی نے گھر میں آگ لگا دی ہے۔

میں جب دوڑ کر باہر جا رہی تھی تو یہ سوچ رہی تھی کہ اب تھوڑی دیر میں یہ سفید چادریں جل کر بالکل راکھ ہو جائیں گی۔ جب ہم سب بچے اور گھر کی عورتیں باہر نکلیں تو ابا جان، چچا میاں اور پھوپھا میاں جو دادا جان کے کوٹھے کے نیچے والی چھت پر ٹہل رہے تھے، انھوں نے ہم سے پکار کر کہا "اندر جاؤ گھبراؤ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا ہے۔" بعد میں جب اس واقعہ کی تفتیش ہوئی تو پتا

پھیلا کہ آگ قریب ہی کی کسی جھونپڑی میں لگائی گئی تھی اور یہ سگنل تھا کہ ہمارے گھر پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن اللہ کی مہربانی ایسی ہوئی کہ کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن مسلمانوں میں ہمت اور جوش و خروش اتنا تھا کہ وہ ہندوؤں کا برابری سے مقابلہ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اور تو اور سرحد کے پٹھان بھی ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے۔

اباجان ۱۸۹۵ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دو بڑے بھائی، ایک چھوٹے بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ اباجان چھوٹے ہی تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا چنانچہ بہت ہی چھوٹی عمر میں انھیں علیگڑھ اسکول کے انگلش ہاؤس کے بورڈنگ میں داخل کر دیا گیا جہاں ان کے دو بڑے بھائی بھی داخل تھے۔ اباجان نے اٹھارہ سال کی عمر میں علیگڑھ یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ال بی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فیض آباد واپس آئے اور دادامیاں کے اسسٹنٹ بن کر وہیں وکالت کرنے لگے۔ دادامیاں منشی امتیاز علی صاحب کا شمار فیض آباد کے کامیاب وکیلوں میں ہوتا تھا۔ اباجان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن سے ہو گئی لیکن ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء کے دسمبر میں ان کی دوسری شادی میری والدہ سے ہوئی۔ آپا کا رنگ بہت صاف تھا یعنی سرخ سفید۔ آپا کہتی تھیں کہ بچپن میں ان کے بال بالکل سنہرے تھے جو آپا کو بہت برے لگتے تھے۔ انھیں بال کالے کرنے کا بہت شوق تھا چنانچہ وہ بالوں کو کالا کرنے کے نسخے لوگوں سے پوچھا کرتیں اور آنولہ پیس پیس کر گھنٹوں بالوں میں لگائے رہتیں۔ جس سے وہ کہتی تھیں کہ ان کے بال کالے ہو گئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے تو آپا کے بال سیاہ ہی دیکھے۔ ہم سب بھائی بہنوں کا رنگ آپا پر نہیں بلکہ اباجان پر گیا۔ آپا کی سہیلیاں ہمیں اور آپا کو دیکھتیں تو یہ ضرور کہتیں کہ کیا ان بچوں کے والد کا رنگ کالا ہے؟ اس پر آپا ہنس دیا کرتیں۔ اور اباجان مذاقاً آپا سے کہتے کہ آپ اسی لیے بچوں کو ساتھ لے کر جاتی ہیں کہ آپ کی سہیلیاں مجھے کالا کہہ کہہ کر میرا مذاق اڑائیں۔

ہم لوگ بچپن میں مشترکہ خاندان میں رہا کرتے۔ اباجان کے تین بھائی

اور ایک چچازاد بھائی دادا میاں کے بنوائے ہوئے وسیع و عریض گھر میں سب ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی پھوپی جان بھی آجایا کرتیں۔ سب کا کھانا ساتھ پکتا تھا اور شادی کے کچھ عرصے بعد ہی گھر کا سارا انتظام آپا کے سپرد ہو گیا تھا کیونکہ ابا جان کے دونوں بڑے بھائی پہلے بیرسٹری کرنے انگلستان اور پھر بزنس کے سلسلے میں فیض آباد سے باہر رہا کرتے۔

ابّا جان کی پریکٹس جیسے ہی چل نکلی دادا میاں صرف ذاتی مطالعہ اور چیمبر پریکٹس کرنے لگے اور پورے خاندان کی کفالت ابّا جان کے ذمّہ ہو گئی۔ اُس زمانے کے آداب قابلِ تعریف ہیں کہ ابّا جان نے خاصی کم عمری میں اِس مشترکہ خاندان کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تاکہ دادا میاں کے سر پہ بار نہ رہے اور آپا بھی کمال کی خاتون تھیں کہ اتنے بڑے خاندان کے لیے سارا انتظام اپنے ہاتھ سے کرتیں اور اُن کے ماتھے پر بل نہ پڑتا۔

۱۹۴۱ء تک ابّا جان فیض آباد کے ضلع کورٹ میں پریکٹس کرتے رہے لیکن پھر وہ چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ بھی اُن کے لیے گھر ہی کی طرح تھا کیونکہ لکھنؤ میں اُن کے خاندانی تعلقات چودھری محمد وسیم صاحب (ریٹائرڈ چیف جسٹس پاکستان سپریم کورٹ محمد حلیم کے والد) اور چودھری نعمت اللہ کے خاندان سے تھے۔ راجہ صاحب پیرپور سے بھی ابّا جان کی دوستی تھی۔ اِس دوستی کا تعلق مسلم لیگ کی "پیرپور رپورٹ" سے بھی ضرور رہا ہوگا کیونکہ اِس رپورٹ کا بھی ذکر ہم لوگ بچپن سے سنتے آئے ہیں۔

جب ہم لوگ کچھ بڑے ہوئے تو ابّا جان کو جب بھی وقت ملتا ہم کو پاس بلا کر ہم سے باتیں کرتے۔ نصیحت آمیز باتیں نہیں بلکہ دلچسپ قصے۔ بہت دلچسپ انداز میں۔ ہم اُن کا ادب بھی بہت کرتے تھے۔ ابّا جان کے سامنے کبھی ہمارا دوپٹہ سر سے نہیں ہٹتا تھا اور نہ ہم اُن کے سامنے لیٹتے تھے۔ یہ باتیں شاید ہمارے بچپن میں ممکن تھیں جب بڑے بڑے گھر ہوا کرتے تھے۔ زنان خانے الگ ہوتے اور مرد عموماً باہر کے حصے میں رہتے تھے۔ آج کل جب دو تین کمروں کے گھروں میں رہائش ہوتی ہے، اِس قسم کے آداب کے مظاہرے نہ ممکن ہیں نہ ہوتے ہی ہیں۔

ابّاجان خود بھی ہمارے سامنے بہت محتاط طریقے سے باتیں کرتے۔ میں نے انھیں کبھی سخت نازیبا الفاظ استعمال کرتے نہیں سنا۔ کسی کی برائی کرنی ہوتی تو عام طور پر مزاحیہ طریقہ استعمال کرتے۔ مثلاً ہمارے ایک قریبی عزیز کی تصویر دیکھ کر کہنے لگے کہ ان کی آنکھوں کا ایکسپریشن ایسا ہے جیسے ان کے سامنے سے ابھی ابھی ایک باگڑ بلا گزر گیا ہو۔ یا اُن کے ایک دوست تھے جن کی کئی لڑکیاں تھیں اور سب کے نام باقافیہ تھے جیسے "سلطانہ" "ریحانہ" وغیرہ۔ ابّاجان اُن سے کہنے لگے کہ اب تم "ایک آنہ" "دو آنہ" سے شروع کرو تو "سولہ آنہ" تک تو قافیہ آسانی سے مل جائے گا اس کے بعد سوچنا پڑے گا۔

ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں نینی تال گئے ہوئے تھے۔ اباجان ایک درخت کے نیچے تنہائی میں بیٹھے کچھ لکھنا چاہ رہے تھے کہ ایک صاحب آگئے اور کہنے لگے میں آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔ اباجان کو اس طرح ان کا مخل ہونا اچھا نہیں لگا۔ لیکن وہ اتنے بامروت تھے کہ کسی سے برملا 'نہیں' نہ کہہ سکتے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی سادگی سے اُن سے یہ پوچھا کہ "آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں آپ کو اپنا ہاتھ دکھاؤں گا یا نہیں؟" وہ صاحب اتنے زچ ہوئے کہ فوراً چلے گئے۔

اسی طرح لکھنؤ میں ایک اور صاحب آئے اور انھوں نے بہائی مذہب کی خوبیوں پر طویل تقریر کرنی شروع کر دی جو ابّاجان کو بار خاطر ہو رہی تھی چنانچہ انھوں نے اُن صاحب سے کہا کہ "جناب آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اسلام کی سکھائی ہوئی باتوں کے مطابق کچھ کہنا چاہتے ہیں یا اُس کے خلاف۔ اگر آپ اُس کے مطابق بتانا چاہتے ہیں تو میں یہ باتیں خود جانتا ہوں اور اگر آپ اُس کے خلاف کہنا چاہتے ہیں تو مجھے معاف کریں کہ میں اِسے سننا نہیں پسند کرتا۔" یہ سن کر وہ صاحب کچھ لاجواب ہو گئے اور انھوں نے اپنا راستہ لیا۔

میری پھوپی جان کہتی ہیں کہ ابّاجان کو بچپن سے خوبصورت چیزیں بہت پسند تھیں۔ انھیں بلیوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اُن کے پاس ایک بلّی پلی ہوتی تھی۔ جب وہ چھوٹے سے تھے تو اُس بلّی کے کان ان کو ضرورت سے زیادہ بڑے معلوم ہوئے تو انھوں نے ایک قینچی لے کر اُس

کے کان کے کنارے تھوڑے سے کتر ڈالے۔

ابّاجان اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی بھی خاموشی سے مدد کیا کرتے۔ ایک دفعہ اُن کے ایک عزیز کو کسی وجہ سے اُن کا بندھا ہوا وظیفہ نہیں ملا تو آپا کہتی ہیں کہ اُن بزرگوار نے ابّاجان کو ایک نہایت ہی دھمکی آمیز اور سخت خط لکھا کہ وظیفہ بھیجنے میں دیر کیوں ہوئی۔ آپا کو تو بہت غصہ آیا لیکن ابّاجان نے معذرت کر کے اُن کا وظیفہ بھیج دیا۔

ابّاجان کو شعر و شاعری اور ادب سے دلچسپی شاید دادا میاں سے ورثہ میں ملی تھی کیونکہ دادا میاں بھی تصنیف و تالیف کے شوقین تھے۔ انھوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے ہملٹ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور رسول اللہؐ کی حیاتِ مبارکہ پر ایک کتاب "سراج منیر" اور اسلامی تاریخ پر ایک کتاب "فتنۂ ابنِ سبا" لکھی تھی۔ یہ کتابیں بچپن میں میں نے دیکھی تھیں اور ان کی کچھ جلدیں میرے پاس تھیں جو کہ افسوس کچھ لوگ عاریتاً مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ کیں۔ اب یہ کتابیں نایاب ہیں۔

تمام بڑے شاعروں کے دیوان سب سے پہلے میں نے ابّاجان کے پاس دیکھے۔ وہ انھیں پڑھتے، اچھے اشعار پر نشان لگاتے، اور جو شعر یا شعری ترکیب انھیں پسند نہ آتی اُس کے نیچے سرخ پنسل سے لائین کھینچ کر حاشیہ پر اپنی رائے لکھتے۔ اُن کے پاس منتخب اشعار کی بیاض بھی رہتی۔ اِس کو شاید وہ بار بار پڑھتے ہوں گے کیونکہ اِس پر بھی اکثر نشانات لگے ہوئے تھے۔

انگریزی ادب میں ابّاجان کو شیکسپیئر، برنارڈ شا اور آسکر وائلڈ سے خاص دلچسپی تھی، چارلس ڈکنس کے ناولوں کی تمام جلدیں اُن کے کمرے کی الماری میں رکھی رہتیں۔ وہ ان کتابوں کے اچھے اچھے پسندیدہ فقرے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیتے۔ پی جی وڈ ہاؤس بھی ابّاجان کو بہت پسند تھا۔ اُس کی کتابیں اُس زمانے میں ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹالوں پر بہت ملا کرتیں اور ابّاجان جب بھی سفر کرتے اُس کی کتاب ضرور خریدتے۔ چنانچہ وڈ ہاؤس کی کتابوں کا ذخیرہ بھی ابّاجان کے پاس اچھا خاصا تھا۔ انھیں کی وجہ سے وڈ ہاؤس کی کتابوں میں ہم لوگوں کو بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔

اردو کی کتابوں میں آبِ حیات، شعراء کے دیوان، رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، مولانا راشد الخیری اور پریم چند کی تقریباً تمام کتابیں ہم لوگوں نے شروع ہی سے اپنے گھر میں دیکھیں۔ ابا جان یہ کتابیں سرسری طور پر نہیں بلکہ غور سے پڑھتے تھے اور پسندیدہ فقروں کو نوٹ کر لیا کرتے تھے۔

ابا جان انتہائی خوش مذاق اور باذوق آدمی تھے۔ وہ اچھی چیزوں کے شوقین تھے۔ اچھا کھانا، اچھے کپڑے، اچھی کتابیں، اچھی موسیقی، اچھے ادب کا انھیں شوق تھا۔ شعرا اور اہلِ ادب سے اُن کی دوستی تھی اور وہ لوگ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے۔ پھلوں میں وہ آموں کے بڑے رسیا تھے۔ اور کوئی چیز وہ نہ خریدتے لیکن آم بہت شوق سے خود خرید کر لاتے۔ کراچی میں جب وہ اٹارنی جنرل ہو کر آئے تو اُن کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ کبھی کبھی (یقیناً مجھے خوش کرنے کے لیے) وہ کہتے اگر تم نے قانون پڑھا ہوتا تو میری بہت مدد کرتیں۔ اِس وقت تو سارا کام مجھے اکیلے کرنا پڑتا ہے۔ گھر ہی پر اُن کا آفس بھی تھا جہاں اُن کی قانونی کتابیں رکھی ہوتیں۔ لیکن اکثر وہ اپنے فائل لے کر اندر اپنے کمرے میں آجاتے اور پلنگ پر بیٹھ کر گاؤ تکیہ لگا کر کام کرتے۔ کبھی کبھی جب میں اُن کے کمرے میں جاتی تو وہ اپنا کام چھوڑ کر مجھ سے باتیں کرنے لگتے اور کہتے کہ تم لوگ میرے پاس آتی کیوں نہیں؟ "آپ اتنے مصروف رہتے ہیں" میں کہتی "ہمیں خیال ہوتا ہے کہ شاید ڈسٹرب ہوں گے"۔ "نہیں تمھارے آنے سے میرا دل بہلتا ہے۔ مجھے سکون ملتا ہے اور دماغ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ پھر میں بہتر کام کر سکتا ہوں"۔ وہ کہا کرتے۔ ہم لڑکیوں کے لیے انھیں رنگین کپڑے چھوٹے چھوٹے بُندے اور چوڑیاں پسند تھیں۔ اگر کبھی کسی کے کانوں میں بُندے نہ ہوتے تو وہ کہتے ہمیں بوچے بوچے کان پسند نہیں جاؤ فوراً بُندے پہنو۔ اسی طرح وہ چاہتے کہ ہم چوڑیاں بھی پہنے رہیں۔ انھیں ہمارا سفید کپڑے پہننا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں دو بچوں کی ماں ہو چکی تھی۔ ایک دن جب میں سفید سلک کی ساری پہنے ہوئے تھی ابا جان کے پاس گئی۔ انھوں نے معمول کے مطابق پیار کیا۔ اپنے پاس بٹھایا اور آپا سے کہنے لگے کہ "ہماری بیٹی کے پاس اچھے کپڑے نہیں

ہیں تم اِس کے لیے کپڑے بنوا دو۔" میں نے کہا "اباجان میں اتنی اچھی سلک کی ساری تو پہنے ہوں۔" "ہاں پہنتے تو ہو لیکن سفید ساری اچھی نہیں لگتی"۔ اِس کے بعد سے اباجان کے پاس جانے سے پہلے میں اپنے کپڑوں کا خاص خیال رکھتی۔

اباجان جو کچھ بھی لکھتے بہت محنت سے لکھتے۔ قانونی مسودے ہوں یا اُن کے ناول اور مضامین۔ وہ اپنے مسودے کو بار بار کاٹتے اور تبدیل کرتے رہتے چنانچہ ایک دفعہ جب ہمارے دادا میاں حیات تھے تو اباجان کے بہنوئی اور رشتے کے ایک سالے جو خود بھی وکیل تھے انھوں نے ایک مقدمے کی تیاری کے سلسلے میں دادا میاں سے کچھ لکھوایا اور اس مسودے کو لے کر شرارتاً اباجان کے پاس گئے کہ دیکھیں اس میں وہ کاٹ چھانٹ کرتے ہیں یا نہیں۔ اباجان نے عادت کے مطابق اس میں بھی کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ جب اُن لوگوں نے اباجان کو بتایا کہ وہ کس کی تحریر تھی تو وہ بہت شرمندہ ہوئے۔

۱۹۴۶ء کے جنرل الکشن میں اباجان یو پی اسمبلی کے لیے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ اُن کے مقابلے میں ایک کانگریسی مسلمان امیدوار تھے۔ یہ الکشن پاکستان کے نام پر لڑے گئے تھے اِس لیے ہر جگہ مسلم لیگ کی فتح ہوئی تھی۔ الکشن کے بعد یہ کانگریسی صاحب اباجان سے کہیں ملے تو اباجان بہت تپاک سے اُن سے گلے ملے۔ لیکن اِس پر ہمارے بڑے ابا بہت ناراض ہوئے "میں نے تو اِس شخص سے ہاتھ بھی نہیں ملایا، تم گلے کیوں ملے؟" انھوں نے بہت خفا ہو کر اباجان سے کہا۔ اُس زمانے میں عام لوگوں کے جذبات انتہائی صورت اختیار کر گئے تھے لیکن اباجان اپنے مخالفین سے بھی رواداری اور اخلاق کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔

گو اباجان مسلم لیگ کے مخلص کارکن اور یو پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد اُن کا کوئی ارادہ لکھنؤ چھوڑ کر پاکستان آنے کا نہ تھا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب اباجان کے علی گڑھ کے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ انھوں نے اباجان کو ڈھاکا آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن لکھنؤ کی بندھی بندھائی پریکٹس چھوڑ کر پھر سے نئی جگہ زندگی شروع کرنا اباجان کو یقیناً مشکل نظر آتا ہوگا اس لیے انھوں نے اِس طرف کوئی توجہ نہ دی تھی لیکن بعض غیر متوقع اتفاقات ایسے ہو جاتے ہیں جو زندگی کا دھارا

یکدم بدل دیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ایک عزیز جو پاکستان آرہے تھے لکھنؤ میں ہمارے گھر آکر ٹھہرے۔ اُن کے جانے کے کچھ دن بعد ہمارے یہاں چوری ہوگئی جس میں کچھ زیورات چاندی کے برتن اور ابّا جان کی ایک رائفل جو اُن کے کمرے میں رکھی تھی چوری ہوگئے۔ اس چوری کی رپورٹ پولیس میں کرائی گئی تو بجائے چوری کی تفتیش کرنے کے پولیس والوں نے بار بار آکر ابّا جان سے رائفل کے بارے میں سوالات کرنا شروع کردیے۔ اُن کو یہ شک ہوا کہ یہ رائفل "مسلم لیگی ایم ال اے" نے اپنے رشتہ دار کے ہاتھ پاکستان بھجوادی ہے۔

یہ بات ابّا جان کو بہت توہین آمیز معلوم ہوئی کہ اُن پر اس قسم کا شک و شبہ کیا جائے۔ چنانچہ اس واقعے کے بعد ابّا جان کا دل ہندوستان سے ہٹ گیا اور انھوں نے پاکستان آنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انھوں نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ڈھاکا آنے کو تیار ہیں۔ خواجہ صاحب اُس وقت مشرقی بنگال کے چیف منسٹر تھے۔ لیکن جب اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ابّا جان ڈھاکا گئے تو قائدِاعظم کا انتقال ہوچکا تھا اور خواجہ ناظم الدین صاحب اُس وقت پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے پر مامور ہوکر کراچی آچکے تھے۔ ابّا جان مشرقی بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل بنا دیے گئے۔ ہم بھائی بہن اور آپا دسمبر ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا پہنچے۔

ڈھاکا میں اُس زمانے میں فضل احمد کریم فضلی صاحب، اظفر صاحب، اور غفران احمد فاروقی صاحب صوبائی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ جسٹس شہاب الدین جو بعد میں پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے اُس وقت مشرقی بنگال کے چیف جسٹس تھے۔ ان سب سے ابّا جان کی ملاقات اور دوستی تھی۔ فضلی صاحب افسر سے زیادہ دوست اور شاعر تھے۔ اُن کے یہاں اکثر شعر و شاعری کی محفلیں سجا کرتیں، ابّا جان کو بھی اپنے گھر میں مشاعرے اور دعوتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اُس زمانے کا ڈھاکا چھوٹا سا شہر تھا لیکن بہت دلچسپ اور گھلا ملا، بنگالی اور غیر بنگالی کا تصور دماغ میں دور دور بھی نہ آتا تھا۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ سب جیسے پاکستان کے نشہ میں مخمور تھے۔ ہمیں ڈھاکے کی موسلادھار بارشیں اور سرسبزی بہت

ہی حسین معلوم ہوتی تھیں۔ وہاں ہمارے کوئی عزیز نہ تھے لیکن دوست عزیزوں سے زیادہ قریب لگتے تھے۔ مجھے ڈھاکا پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایڈن گرلز کالج میں انگریزی کی پروفیسر شپ کی جگہ مل گئی اور میں پڑھانا تو شروع ہی سے چاہتی تھی، اِس ملازمت سے بہت خوش ہوئی۔ ڈھاکا میں میرے ملازمت کرنے پر کوئی اعتراض کرنے والا عزیز یا رشتہ دار نہ تھا کیونکہ اِس معاملے میں رشتہ دار اور عزیز سب سے زیادہ مزاحمت کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم لوگ اُس وقت فیض آباد یا لکھنؤ میں ہوتے تو بڑے اعتراضات ہوتے۔ کوئی بڑی بی کہتیں "اے ہے، بھلا فیاض میاں کو کیا ہو گیا کہ بیٹی سے نوکری کراتے لگے۔ کیا اسی دن کے لیے لڑکیوں کو بی اے، ایم اے کرایا تھا؟" کوئی صاحبہ کہتیں "اے بی بی میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب فیاض میاں نے لڑکیوں کو لکھنؤ کے بورڈنگ ہاؤس میں بھیجا تھا۔ بھلا ہمارے خاندان میں کبھی لڑکیوں نے گھر سے باہر قدم رکھا تھا جو انھوں نے ایسا کیا؟" غرض مجھے یقین تھا کہ اگر ہم ڈھاکا میں نہ ہوتے تو اسی قسم کی باتیں سننے کو ملتیں اور اتنے اعتراض کیے جاتے کہ میں ملازمت کرنے کا خیال بھی نہ کر سکتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان بن گیا تھا اور ہم لوگ پہلے ڈھاکا گئے جہاں ہمارے عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا۔ اور ہم نے اصلی آزادی کی فضا میں سانس لیا۔ یہ آزادی اُس وقت صرف سیاسی آزادی ہی نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ ذہنی آزادی بھی تھی۔

روپے پیسے کے معاملے میں ابّا جان انتہائی بے پروا تھے۔ بہت سے بڑے بڑے مقدمے وہ صرف دوستی اور رواداری میں مفت کرتے۔ ضرورت مندوں اور غریبوں سے بھی فیس نہ لیتے بلکہ انھیں ہفتوں اپنے گھر ٹھہراتے اور اُن کا کام کرتے۔ اور جن موکلوں کو فیس دینی بھی ہوتی وہ بھی اکثر مقدمات کے ختم ہونے کے بعد نہ دیتے اور ابّا جان یا اُن کے منشی اُن سے تقاضا نہ کرتے۔ چنانچہ ابّا جان کے ڈھاکا جانے کے بعد جب ہم لوگ لکھنؤ سے روانہ ہو رہے تھے تو ابّا جان کے کئی دولت مند موکل (راجہ اور تعلقدار صاحبان) جن پر ابّا جان کی بھاری فیسیں واجب تھیں وہ بھانجی مار گئے اور ابّا جان نے اُن سے تقاضا بھی نہ کیا۔

اُن کو دراصل علم و ادب سے شوق تھا۔ اُن کا ناول "شمیم" اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا۔ اُس میں ہندوستانی مسلمانوں کے شریف خاندانوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا شگفتہ اور ڈرامائی طرزِ تحریر علیگڑھ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی کی یاد دلاتا اور نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اندازِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ "انور" جو کئی سال بعد لکھا گیا نسبتہً سنجیدہ مسائل سے متعلق ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری اور اندازِ بیان میں زیادہ فکر انگیز ہے۔ لیکن اس کا طرزِ تحریر بھی شوخ اور شگفتہ ہے۔ اِس ناول کو سید شوکت حسین رضوی نے "دوست" کے نام سے فلمایا بھی ہے۔ یہ فلم ہندوستانی فلموں میں خاصی مقبول ہوئی۔

وہ "انور" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "اگر کسی مصنّف کی دنیوی جنت یہی ہے کہ اُس کی تصنیف قدر و محبت سے دیکھی جائے اور ہر عورت اور ہر مرد بلا قیدِ سِن و سال اس کا نہایت محبت آمیز اور پُرجوش استقبال کرے تو یقیناً "شمیم" کے لکھنے کے بعد مجھے میری دنیوی جنت مل گئی"۔ ... وہ لکھتے ہیں کہ "وکالت کی بڑھتی ہوئی مصروفیتیں... اور سیاسیات کے ہنگاموں کی دلچسپیاں اور مصیبتیں مجھے اِس درجہ اپنی پیچ در پیچ زنجیروں میں الجھائے رہیں کہ انشائے لطیف کی طرف توجہ کرنے کی مجھے مستقل فرصت نصیب نہ ہوئی۔... مگر آخر کار پھر میری بے چین طبیعت میں..... لہر اٹھی... پھر میرے شورش پسند دماغ نے مجھے مجبور کیا کہ کچھ لکھوں...... پھر نفسیات کی مشکل وادیوں کے پُراسرار نشیب و فراز آپ کو دکھاؤں .... چنانچہ میں نے کچھ حسین صورتوں (کیونکہ بدصورتی سے دلچسپی پیدا ہونا مشکل ہے)..... کچھ لطیف مباحثے..... خیالات و جذبات کا ایک صنم خانہ..... زندگی کی نیرنگیوں کا ایک سچّا مرقع آپ کی دلچسپی کے لیے تیار کیا اور اب بطور ایک ناچیز تصنیف کے آپ کی خدمت میں 'انور' کے نام سے پیش کرتا ہوں"۔

ابّا جان جتنی دلچسپ باتیں کرتے اتنے ہی دلچسپ خط بھی لکھتے تھے۔ اُن کے خطوں میں محبت کے ساتھ ساتھ شگفتہ انداز میں نصیحتیں بھی ہوتی تھیں اُن کی گفتگو میں نرمی، مزاح، شگفتگی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔ ہم چار بہنیں اور تین بھائی تھے۔ انھوں نے بھائیوں کا تو کبھی

کبھی سختی سے تنبیہہ ضرور کی لیکن ہم چار بہنوں سے ہمیشہ انتہائی محبت سے پیش آتے۔ اگر کبھی ابّاجان انتہائے مصروفیت میں گھر کے اندر آتے اور ہمیں پیار نہ کرتے یا محبت سے بات نہ کرتے (جو کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا) تو ہم لوگ فوراً بُرا مان جاتے۔ اور اُن کو جب آپا کے ذریعے یہ معلوم ہوتا کہ ہم بُرا مان گئے ہیں تو وہ خاص طور پر ہمیں مناتے، ہمیں پیار کرتے اور ہمیں خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ کہتے کہ تمھاری آپا تو تم لوگوں کو جو چاہیں کہہ دیتی ہیں تم خفا نہیں ہوتیں اور مجھ سے فوراً خفا ہو جاتی ہو"

ابّاجان بے حد مذہبی تھے لیکن زاہد خشک کی طرح سخت نہیں۔ مذہب اور خدا کے متعلق اُن کا تصور عام لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ کہا کرتے کہ اللہ میاں ہمارے سب سے اچھے دوست ہیں، انتہائی محبت کرنے والے اور مہربان ماں باپ سے بھی زیادہ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اللہ سے مانگو بلکہ اگر شکایت بھی کرنی ہو تو اللہ میاں سے برملا کرو۔ وہ دوست کی طرح سب کی سنتا ہے کیونکہ وہ رگِ گلو سے بھی زیادہ تمھارے نزدیک ہے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر پڑھتے:

مایوس نہ یوں ہوتے تو درد اگر ہوتا
ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا

اقبال کے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کے بہت سے اشعار انھیں یاد تھے اور انھیں کی وجہ سے میں نے بھی کم عمری ہی میں جب مجھے اِن دونوں نظموں کے بہت سے اشعار کے معنی بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے، دونوں نظمیں یاد کر لی تھیں۔ ابّاجان کہا کرتے کہ اقبال اگر صرف "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" ہی لکھتے اور کچھ نہ بھی لکھتے تو اللہ میاں اِن دونوں نظموں پر اُن کی بخشش ضرور کر دیتے۔

ابّاجان ہم سے تاکید کرتے کہ ہم لوگ قرآن شریف ہمیشہ بامعنی پڑھا کریں، چاہے صرف ایک صفحہ یا دو صفحے ہی پڑھ سکیں۔ وہ خود بھی قرآن شریف بہت غور سے پڑھتے۔ اُن کے اپنے قرآن شریف پر باقاعدہ سرخ پنسل سے لکیریں کھنچی ہوتیں اور حاشیہ پر نوٹس لکھے ہوتے۔

وہ کبھی کبھی اپنی طالب علمی کے زمانے کے بھی قصے ہمیں سناتے

تھے چنانچہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو اُن کے ایک سینیئر ساتھی جن سے خاندانی تعلقات بھی تھے اور جو بعد میں ہندوستان پاکستان کے مشہور سیاسی رہنما بھی ہوئے یونین کے الکشن کے لیے کھڑے ہوئے وہ اپنی تقریروں میں اپنے مخالف امیدوار کو نہ صرف بُرا بھلا کہتے بلکہ ان کے بارے میں بعض اوقات تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ بھی استعمال کرتے۔ اباجان عمر میں اُن سے بہت چھوٹے تھے اس لیے اُن کا بہت ادب کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے آخر ہمت کر کے اُن صاحب سے کہا کہ "..... بھائی آپ اپنی تقریروں میں اتنے خراب کلمات کیوں استعمال کرتے ہیں ... یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" تو انھوں نے بڑے تحکمانہ اور پُراعتماد انداز میں اباجان سے کہا "میاں تم سیاست کیا جانو۔ بھئی سیاست میں یہی ہوتا ہے جب تم اپنے مخالف کو سَو گالیاں دوگے تو سننے والے یہ سوچیں گے کہ ان میں سے کم از کم چار یا پانچ تو ضرور صحیح ہوں گی۔"

یہ قصّہ جرمن لیڈر گوئبلز کا فلسفہ عام ہونے سے بہت پہلے کا ہے۔ کیونکہ اباجان علی گڑھ میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آخر میں تھے اور گوئبلز کے پروپیگنڈے کا فلسفہ اس صدی کے تیسرے چوتھے عشرے میں عام ہوا۔

اباجان کے کپڑے ہمیشہ آپا خریدتیں اور اُن کا کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے خود پکاتیں۔ خاص طور پر ۱۹۵۲ء کے بعد سے جب اباجان پر دل کا حملہ ہوا اُن کا پرہیزی کھانا آپا بڑے اہتمام سے خود تیار کرتیں۔ اباجان کہا کرتے "میں بہت خوش قسمت ہوں۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی اتنی کامیاب اور خوشگوار ہو..... جو اپنی بیوی سے بھی اتنے خوش ہوں اور اپنے بچّوں سے بھی جتنا کہ میں ہوں۔"

اس لیے جب ۱۹۵۳ء کے آخر میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اباجان نے خاموشی سے ایک اور شادی کر لی ہے تو ہم سب کو اتنا شدید شاک ہوا کہ کئی دن تک ہم اپنا ذہنی اور جذباتی توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ ہمیں ہر چیز دھوکا نظر آنے لگی..... ہر چیز پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے بے لوث خدمت کرنے کا، ہم نے سوچا۔ ہم سب بھائی بہن بے حد پریشان

اور ابّاجان سے بہت ناراض تھے ۔ ۔ ۔ اُس وقت اباجان کسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنی ایک ماہ کی بچّی کو بہلا رہی تھی کہ بڑے ابا آگئے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اباجان کی طرفداری کر کی شرع کی اور مذہب کا سہارا لیا۔ ۔ ۔ "مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے جل کر روتے ہوئے کہا۔ "جس میں نا انصافی ہو" ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے ابا سخت ناراض ہوئے اور انھوں نے خاندان میں سب سے کہا کہ "سلو ملحد ہوگئی ہے۔ اِس سے کوئی نہ ملے"۔

ہم سب بھائی بہن اپنی اپنی جگہ گھٹن رہے تھے۔ صرف آپا بیچاری روایتی، نیک اور خدمت گذار بیوی کی طرح دل ہی دل میں کڑھ رہی تھیں اور کچھ نہ کہتی تھیں۔ چنانچہ جب اباجان لاہور سے واپس آئے تو ہم سب (بھائی بہن) دل کے پھپھولے پھوڑنے کو تیار تھے۔ زندگی میں پہلی دفعہ اباجان سے سخت ناراض تھے۔ وہ تو ہمارے آئیڈیل تھے ہر لحاظ سے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ ۔ ۔ ابّاجان آئے تو انھوں نے معمول کے مطابق ہمیں لپٹایا پیار کیا اور اپنے پاس بٹھا کر ہمیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ اُن کی محبت میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہے اور ان کا رویّہ ہم سب کی طرف بالکل ویسا ہی رہے گا جیسا کہ ہمیشہ تھا۔ اِس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ لیکن ہم لوگ بالکل راضی نہ ہوئے اور مَیں نے پہلی دفعہ ابّاجان سے ترشی (گستاخی) سے بات کی جس کے جواب میں بیچارے ابّاجان محبت ہی سے بات کرتے رہے اور یہی کوشش کرتے رہے کہ ہم ان سے خوش ہوجائیں۔ آپا کو اِس وقت بھی ابّاجان کی صحت کا اتنا ہی خیال تھا جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ "اب تم لوگ اپنے ابّاجان سے کچھ نہ کہنا۔ وہ دل کے مریض ہیں۔ کہیں اُن کے دل پر بُرا اثر نہ پڑ جائے"۔

ابّاجان کے رویّہ میں تبدیلی تو خیر کیا ہوتی۔ اب اُن کی کوشش ہر وقت یہی رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہم بھائی بہنوں اور آپا کو ہر طرح خوش رکھیں۔ چنانچہ جب میری سب سے چھوٹی بہن کی شادی ہونے لگی تو ابّاجان خود بازار جا جا کر اُس کے لیے چیزیں خریدتے جو انھوں نے ہم سب کی شادیوں میں بالکل نہیں کیا تھا۔ وہ ہر طرح سے ہم سب پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے

کہ ان کی جبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ دراصل وہ بہت ہی پیارے آدمی تھے اور ہر محفل کی جان بن جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو بھی اتنی ہی دلچسپ ہوتی جیسی ان کی تحریر۔ ظاہر ہے کہ خواتین بھی اُن سے دلچسپی لیتی ہوں گی اور اُن "خاتون" صاحبہ کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ اباجان کی تحریر پر اس قدر فریفتہ ہوگئی تھیں کہ اپنے شوہر اور دو بچوں کو بھی چھوڑنے کو تیار تھیں۔ ماما حوّا آدمؑ کی روزِ اوّل سے کمزوری رہی ہیں۔ "اہلِ قلم" کے لیے دلچسپی اور فریفتگی کا یہ اظہار شاید اُن کی پسپائی کا سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے۔ خاص کر جب یہ حربہ جوان اور خوش شکل عورت کی طرف سے استعمال کیا جائے۔

آخری چند برسوں میں اباجان پر پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا بار بہت زیادہ پڑ گیا تھا۔ اور انھیں دن دن بھر اور کبھی کبھی صبح کے تین تین اور چار چار بجے تک بیٹھ کر مقدمات کی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ اُن کا تیسرا ناول جو زیرِ تحریر تھا نامکمل رہ گیا۔ آخری مرتبہ جب میں اباجان کے پاس گئی تو وہ مجھ سے مختلف افسران اور وزرا کے ٹیلیفون ملوا رہے تھے اور اُن سے یہی باتیں کر رہے تھے کہ اُن کے لیے کسی اسسٹنٹ کی تقرری کی جائے کیونکہ کام بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ دوسرے دن وہ کسی مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں لاہور جانے والے تھے (اُس زمانے میں سپریم کورٹ کا دفتر لاہور میں تھا) انھوں نے کہا تھا کہ وہ عید سے ایک دن پہلے کراچی واپس آجائیں گے۔ اُس رات اتفاق سے میں آپا ہی کے پاس رُک گئی تھی جب تقریباً ساڑھے بارہ بجے رات (۸-اپریل ۱۹۵۹ء) لاہور سے ڈاکٹر کا ٹیلیفون آیا اور اُس نے اباجان کے بارے پریشان کن خبر سنائی۔ میں نے ہی یہ ٹیلیفون رسیو کیا تھا۔ آپا گھبرا گھبرا کر پوچھتی رہیں کہ کیا ہوا ...... میں نے آپا کو کس طرح یہ خبر سنائی میرا ہی دل جانتا ہے۔

اباجان اپنے وعدے کے مطابق عید سے ایک دن پہلے ضرور آگئے لیکن ہم سب سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کے لیے۔

اباجان کے چلے جانے کے بعد بہت دنوں تک ایسا لگتا تھا جیسے میں ہنسنا بھول گئی ہوں۔ کسی کو ہنستے دیکھتی تو دل میں عجیب سی تکلیف ہوتی۔

میں سوچتی کہ شاید اب میں کبھی ہنس نہ سکوں گی۔ لیکن انسان زندگی کے بہتے ہوئے دھارے میں رفتہ رفتہ خود بھی بہنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید دنیا کب کی ختم ہو گئی ہوتی۔

میرا چھوٹا بھائی رفیع جسے میں پیارے بھیا کہتی ہوں فوج میں میجر تھا اور ان دنوں جہلم میں تھا۔ ۸ اپریل کی اسی رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ابا جان سے اس کی ٹیلیفون پر باتیں ہوتی تھیں۔ وہ بالکل ٹھیک تھے اور ان کا مقدمہ اس شام کو ختم ہو گیا تھا اور وہ بہت مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ زندگی کے طوفان کے بعد شاید یہ سکون کے آخری چند لمحے تھے!
